eISSN: 2707-6229
pISSN: 2707-6210

حمیرا
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، دی ویمن یونیورسٹی، ملتان
ڈاکٹر شاہدہ رسول
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، دی ویمن یونیورسٹی، ملتان

Humaira
PhD. Scholar, Department of Urdu, the Women University, Multan
Dr Shahida Rasool **Email:** shahidarasool9@gmail.com
Assistant Professor, Department of Urdu, the Women University, Multan

رپورتاژ "شہر" کا تہذیبی و سماجی مطالعہ

A CULTURAL AND SOCIAL PERUSAL OF REPORTAGE "SHEHER"

DOI: https://doi.org/10.56276/tasdiq.v4i01.93

ABSTRACT

Ibrahim Jalees' reportage "Sheher" is a masterpiece of non-fictional literature. The cultural and traditional life of Bombay city is the main subject. The writer has tried to represent the helpless and miserable urban life probing from its artificial brightness. Also, it is the sorrowful lamentation of the valuelessness of ancient literature, culture, values and social life in the artificial glittering capitalist civilization. All the above issues have been addressed with a literary spell and beauty. The struggle for livelihood can be observed in this reportage. This "Reportage" is a literary and historical document about the multicultural civilization and society's representation of the city's development.

KEYWORDS
Reportage, Ibrahim Jalees, Non-Fiction, Miserable Life, Lamentation, Capitalism, Livelihood, Literary and Historical Document, Civilization.

Received: 10-May-22 **Accepted**: 15-Jun-22 **Online**: 30-Jun-22

کلیدی الفاظ:
غیر افسانوی، کلبلاتی زندگی، دلخراش نوحہ، سرمایہ دارانہ تہذیب، کسب معاش، تاریخی و ادبی دستاویز، مخلوط کلچر

ابراہیم جلیس کا رپورتاژ 'شہر' غیر افسانوی ادب کا ایک شاہکار ہے۔ جس میں بمبئی شہر کی تہذیبی و تمدنی ترقی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مصنف نے شہر کی جگمگاتی روشنیوں کے پیچھے سسکتی، کلبلاتی زندگی کے نمونے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ تہذیب کی چکاچوند میں صدیوں پرانی معاشرتی و سماجی زندگی، اقدار اور روایات کے ساتھ، ثقافت اور ادب کی ناقدری کا دلخراش نوحہ ہے جسے ادبی حسن و دلکشی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں کسبِ معاش کی جدوجہد کی روداد کے پیچھے ایک عہد کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ مخلوط کلچر، تہذیب اور سماج کی پیش کش میں یہ رپورتاژ شہر کی ترقی کی تاریخی و ادبی دستاویز ہے۔

ابراہیم جلیس (۱۹۲۴ء۔۱۹۷۷ء) اردو کے ممتاز ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے افسانوی و غیر افسانوی ادب میں یکساں طبع آزمائی کی اور اپنے منفرد اندازِ تحریر کی بدولت جلد مقبولیت حاصل کر لی۔ اگرچہ انہوں نے شاعری سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ جس کا ثبوت ان کا قلمی نام جلیس ہے لیکن وہ بہت جلد نثر کی طرف راغب ہو گئے۔ وہ انجمن ترقی مصنفین کی کل ہند کانفرنس منعقدہ حیدر آباد دکن میں شریک ہوئے۔ اس کے رکن بنے اور پھر تمام عمر ایک سچے ادیب کی طرح منافقت زدہ ماحول کے خلاف جدوجہد میں مصروف رہے۔ انہوں نے خصوصاً اپنے عہد کی زندگی اور معاشرت کو اپنا موضوع بنایا۔

فرانس میں حقیقت نگاری کی تحریک کے تحت رپورتاژ نگاری کا آغاز ہوا۔ ترقی پسند تحریک نے اس تحریک سے بہت زیادہ اثرات قبول کیے اور اردو ادب کو غیر افسانوی صنف "رپورتاژ" کا تحفہ دیا۔ رپورتاژ فرانسیسی ادب میں صحافتی رپورٹ کو کہتے ہیں جبکہ انگریزی میں اس صنف کے لیے Reportage کا لفظ استعمال کیا گیا۔ ابراہیم جلیس نے اس کا ترجمہ "رپورتاج" کے نام سے کیا مگر اس نام کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی جو کرشن چندر کے ترجمہ رپورتاژ کے حصے میں آئی۔ رپورتاژ میں کسی تقریب جلسے یا ادبی محفل کا آنکھوں دیکھا حال یا روداد حقیقی واقعات و حالات کے ساتھ مصنف کی اپنی موجودگی کے ساتھ بیان کی جاتی ہے کہ منظر نگاری، جذبات نگاری، اور جزئیات نگاری کے ساتھ ادیب اسے فنی چابکدستی سے دلکش پیرائیہ میں بیان کرتا ہے کہ مصدقہ واقعات کے ساتھ تاریخی سچائی اور صحت واقعہ کے علاوہ آپ بیتی کے عناصر بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے نیم صحافتی اور نیم ادبی رپورٹ بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں افسانے کی کہانی ناول کا پلاٹ اور ڈرامائی عناصر کی موجودگی اسے ادبی دوام بخشتی ہے۔

رپورتاژ نگاری کو تقسیم ہند اور فسادات کے تناظر میں لکھے گئے ادب کے زمانے میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ کرشن چندر کا رپورتاژ "پودے" اور سجاد ظہیر کا "یادیں" اس کی ابتدائی امثال ہیں۔ اپنی مقبولیت کی طرف بڑھنے والی اس صنف میں بہت سے نامور ادیبوں نے طبع آزمائی کی اور اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ ان میں پرکاش پنڈت کا رپورتاژ "کہت کبیر بھٹی سادھو"، عصمت چغتائی کا "بمبئی سے بھوپال تک" صفیہ اختر کا "ایک ہنگامہ" فکر تونسوی کا "چھٹا دریا"، شاہد احمد دہلوی کا "دلی کی بپتا" قرۃ العین حیدر کا "لندن لیٹر" قدرت اللہ شہاب کا "اے بنی اسرائیل"، رام لعل کا "احساس کی یاترا"، ممتاز مفتی کا "لبیک" مسعود مفتی کا "چہرے اور مہرے" اور ابراہیم جلیس کا "دو ملک ایک کہانی" ناقابل فراموش رپورتاژ ہیں۔

اُردو ادب میں بہت سے موضوعات پر رپورتاژ لکھے گئے۔ ناول، افسانہ، غزل، نظم اور ڈرامہ کے علاوہ رپورتاژوں میں بھی زندگی اور اس کے متعلقات کو سلیقے سے پیش کیا گیا۔ انہیں عوام نے بھی بہت سراہا۔ اسی صف میں ابراہیم جلیس بہت نمایاں

نظر آتے ہیں کیونکہ وہ ادبی افق پر فکر نو کے ساتھ نمودار ہوئے تو زندگی کی حرارت سے مملوان کی تحریریں جاوداں فن کے ساتھ معتبر ٹھہریں۔

ابراہیم جلیس نے ۱۹۴۴ء میں حصولِ روزگار کی خاطر بمبئی شہر کا سفر کیا۔ اس عہد میں معاشرہ جن اخلاقی قدروں کے زوال کا شکار تھا۔ اس داخلی اور خارجی سطح پر زندگی میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں انہوں نے نہ صرف اس کو برتا بلکہ ان کی تفصیلات پر مشتمل اپنا پہلا رپورتاژ "شہر" کے نام سے پیش کر دیا۔ یہ رپورتاژ ہفتہ وار رسالہ "نظام" بمبئی سے سات اقساط میں شائع ہوا جو بظاہر ایک بے روزگار نوجوان کی حصول معاش کی خاطر در در کی خاک چھاننے کی روداد نظر آتا ہے مگر حقیقتاً زندگی کے انہدام کا ایک دلگداز نوحہ ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی تہذیبی و سماجی متغیر فضا کا آئینہ دکھاتا یہ رپورتاژ دوسری مرتبہ خیال امروہوی کی زیرِ ادارت چھپنے والے ماہنامہ "سپوتنک" میں ۲۰۰۱ء میں چھپ کر سامنے آیا۔ جسے ڈاکٹر امتیاز بلوچ نے مرتب کیا تھا۔ تاحال یہ ایک نایاب اور کمیاب رپورتاژ ہے جو ابھی تک کتابی صورت میں چھپ کر سامنے آیا۔

برصغیر کی دھرتی جو راجے مہاراجوں کی نگری تھی۔ انگریز کے قدموں سے تاراج ہوئی تو غلامی اور سازشوں کے جال نے ٹوٹے بکھرے عوام میں آزادی کی خواہش کو تیز کر دیا۔ مقتدر، سرمایہ دار اور جاگیر دار طبقے نے غریب اور بے بس عوام کو بدحالی کے اُس گڑھے میں لا پھینکا۔ جہاں وہ اپنی خواہشات سمیت زمین بوس ہونے لگے۔ ایسے طبقے کے حق میں اور ان کو شعوری آگاہی کی خاطر جن ادیبوں نے فلم کی طاقت کو استعمال کیا۔ اس میں ابراہیم جلیس پیش پیش رہے۔ انہوں نے رنگینی زمانہ کے ساتھ خطِ غربت سے نیچے سسکتی بلکتی زندگی اور تمدنی ترقی کے پہلو میں تہذیبی فرسودگی کو اجاگر کیا۔ تہذیبی و سماجی سرگرمیاں کسی قوم، ملک یا شہر کو سمجھنے میں کتنی معاون ثابت ہوتی ہیں۔ یہ سب انہوں نے اپنے رپورتاژ کا حصہ بنا دیا۔ اس کے متعلق ڈاکٹر محمد حسن نے لکھا تھا:۔

> "ادب انسان کی باطنی تاریخ ہے۔ اس باطنی تاریخ کے تانے بانے سے سماجی زندگی کی ادھوری داستان پوری ہوتی ہے۔ ادب کا مطالعہ تاریخ، کو رنگ اور ماضی کو تکمیل عطا کرتا ہے۔ اس کے بغیر سماج کے اوپری ڈھانچے کا خاکہ اُبھر تو سکتا ہے مگر اس سماج کے اندر رہنے والوں کے دلوں کے ارمان، ان کے خواب و خیال، ان کے جذبے اور آرزومندیوں کا عرفان نہیں ہو سکتا اور اس عرفان کے بغیر یہ جاننا کیونکر ممکن ہو گا کہ حالات نے کس دور کو کس انداز سے متاثر کیا اور کس قسم کے ردِ عمل پیدا کیے۔"(۱)

ابراہیم جلیس نے اپنے ادب پارے "شہر" میں سماجی زندگی کی تاریخی داستان کا سچا کھرا نقشہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے قوم کے فکر و عمل اور ان کے مزاج اور کردار کے اعلیٰ و مضحک خاکے عمدگی سے کھینچے ہیں۔ نیز شہری و دیہی زندگی کے تقابل میں شہری تمدنی زندگی کی ترقی اور ثقافتی سرگرمیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی رنگینیوں کو جائزہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔ مصنف نے سماجی زندگی کی خوبیوں اور خامیوں کا بڑے دلچسپ حقیقت پسندانہ انداز میں تجزیہ پیش کیا ہے۔ جس سے سماجی مسائل کی عکاسی کے ساتھ انسانی ذات کا کرب بھی نمایاں ہوا ہے۔ انہوں نے نئی تہذیب کے نئے تقاضوں اور بدلتے رسوم و رواج اور

اقدار کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ اعلیٰ سوسائٹی اور اس کے لوازمات میں رشتوں کی نئی معنویت کو ابھارا اور صدیوں کی تہذیبی اقدار سے نبرد آزما انسانیت کو اپنے رپورتاژ میں خوبصورتی سے پیش کر دیا۔ طارق اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"ادب خواہ کسی بھی زبان کا ہو، سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس لیے ہر ادیب سماج کے تانے بانے کو جوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نظریات مختلف ہوں، راستے الگ الگ ہوں، مگر سبھی انسانی سماج کا راگ الاپتے ہیں، جو جتنا بڑا ادیب ہوتا ہے وہ اتنی ہی طاقت سے انسان اور انسانی سماج کے حق میں آواز بلند کرتا ہے۔ یہی عکس و نقش اردو ادب میں بھی نمایاں ہے۔ میر ہوں یا غالب، اقبال ہوں، یا جوش، پریم چند ہوں یا منٹو سب انسانیت کی بات کرتے ہیں اور انسانی اقدار کو اپنے اپنے رنگ ڈھنگ سے تقویت پہنچاتے ہیں۔"(۲)

تمدنی زندگی کی ترقی میں معیشت کا بڑا ہاتھ ہے اور اسے سہارا دینے والے جاگیر دار اور سرمایہ دار سب سے نمایاں ہوتے ہیں۔ وہیں چھوٹے پیشوں سے وابستہ افراد بھی اس کی مضبوطی کا باعث بنتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں قابل اعتنا تصور نہیں کیا جاتا۔ معاشی خوشحالی اور تہذیبی ترقی لازم و ملزوم ہیں۔ ہر شخص معاشرے کے مقررہ معیار تک پہنچنے کی تگ و دو میں مصروف رہتا ہے وہیں چند مفاد پرست وقتی اور ناقابل بیان پیشے اختیار کر کے مالی فوائد سمیٹتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً شہری زندگی میں روز افزوں ترقی کے سبب یہاں اشیائے ضروریہ فراہم کی جاتی ہیں۔ امیر ہوٹل کا رخ کرتے ہیں تو غریب تنگدستی کے باعث یہ اشیاء مثلاً چارپائی، بستر، تکیہ، شیشہ وغیرہ بوقت ضرورت قیمتاً حاصل کر کے سہولت سے فیض یاب ہوتے ہیں اور کچھ نہ ملے تو لوگ حوائج ضروریہ کے اخراج کے لیے پبلک ٹوائلٹ نہ ہونے کے باعث گھریلو استعمال کے ٹوائلٹ قیمتاً استعمال کروا کے دورخی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ مشرقی سماجی روایات میں مہمان کی آمد کو خدا کی رحمت تصور کیا جاتا ہے۔ مگر بدلتی اقدار اور معاشی مجبوریوں نے اجرتی مہمان کے کلچر کا آغاز کیا جس نے صدیوں پرانی تہذیبی روایات کو کچل ڈالا۔ اس تہذیب کا پردہ ابراہیم جلیس یوں چاک کرتے ہیں:

"اجرتی مہمان کے نام سے آپ کو اچنبا ہو رہا ہے میں نے کہا ناں کہ حاتم طائی والا زمانہ گیا جبکہ مہمان آتے تو لوگ سمجھتے کہ بھگوان آئے۔ مہمان کے لیے اچھے سے اچھا کھانا، اچھے سے اچھا بستر، اچھے سے اچھا کمرہ دیا جاتا تھا۔۔۔ مگر چونکہ اب غیر متمدن قبائل کی تہذیب مر گئی ہے اور شہری تہذیب نے جنم لیا ہے اس لیے مہمان بھگوان نہ رہے بلکہ اجرتی مہمان بن گئے۔"(۳)

شہر مختلف النوع لوگوں کی قیام گاہ بنتا ہے تو کثیر القومی آبادی کے اختلاط کے باعث مختلف مشرقی روایات اور تمدن پروان چڑھتے ہیں۔ جس کے باعث ایک ایسا ملغوبہ کلچر پروان چڑھتا ہے۔ جس میں دوستی اور محبت کا کہیں شائبہ تک نہیں ہوتا۔ مختلف قوموں کے اختلاط کے سبب صرف لباس اور انداز و اطوار نہیں، رسوم و رواج اور زبان و فہم کے انداز بھی بدل جاتے ہیں۔ مختلف علاقائی زبانوں کے علاوہ مغرب زدہ کلچر سے ایسی زبان پروان چڑھتی ہے جو صرف اظہار مدعا سمجھ آنے سے غرض رکھتی ہے۔ زبان سے پیدا ہونے والا تہذیبی تصادم اور تضاد کی نشاندہی کے ساتھ مصنف نے مختلف علاقوں اور قوموں کی بولیوں اور زبان کی متفرق خصوصیات کو بھی اجاگر کیا ہے۔

ابراہیم جلیس نے شہری زندگی کی عکاسی میں عمومی، سماجی، مسائل کو اجاگر کرتے ہوئے معاشرتی ناہمواریوں اور ناقدریوں پر چوٹ بھی کی ہے۔ معاشرتی زندگی کے عدم استحکام، کا سبب انہوں نے معاشی تنگدستی کو قرار دیا ہے۔ جس کے باعث مشرقی روایات زوال پذیری کا شکار ہوئیں۔ وہیں جمالیاتی اقدار کے تحسین آفرینی کے ذرائع بھی سماجی جبر اور گھٹن کا شکار ہوئے۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت اور مفاد پرست ہوس زر کے پجاری تعلیم و تربیت ہو یا عشق و محبت، ہر قسم کے جذبات کو ایک ہی ترازو میں تولتے ہیں۔ تمدنی ترقی کا راز شہر کے بہترین ذرائع آمد و رفت سے جڑا ہوتا ہے۔ ان ذرائع کی مستقل فراہمی اور بہترین سہولیات کو یقینی بنانے کے لیے حکومتی اداروں اور میونسپل کمیٹی کے انتظامات بڑے معنی رکھتے ہیں۔ مگر مصنف نے ان کی ناقص عمومی انتظامات پر سوالیہ نشان لگایا ہے کہ شہری زندگی کو متعفن زدہ کرنے اور معاشرتی بگاڑ میں اضافہ کرنے میں انہیں اداروں کی بے حسی اور بے عملی کا کردار نمایاں ہے۔ ایک طرف ذرائع آمد و رفت کی بروقت دستیابی کے باعث عمومی سیاحتی مقامات تفریح فراہم کر کے زر مبادلہ کمانے کا باعث بنتے ہیں تو دوسری طرف عدم دستیابی سے یہی عوامی مقامات جوہڑ پاکھنڈر میں تبدیل ہو کر صورتحال کو گھمبیر کر دیتے ہیں۔

رپورتاژ شہر میں جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام، صنعتی دوڑ اور بے لگام غربت سے تباہ حال تمدنی ترقی کا پردہ بھی چاک کیا گیا ہے۔ گنجان آبادی سے نبرد آزما شہری بدلتی سماجی اور تہذیبی اقدار سے بھی نبرد آزما تھے۔ ہوس زر سب سے بڑی معاشرتی قدر بن کر سامنے آئی تھی۔ اس کی چکاچوند نے نوجوانوں کی آنکھوں کو خیرہ، جوانوں کو بے حس اور بوڑھوں کو بے حال کر رکھا تھا۔ چادر اور چار دیواری کا تقدس دوسرا مفہوم اختیار کر گیا۔ اپنی بیوی بیٹی اور بہن کے تصور نے اپنا گھر، اپنا سکھ، اپنا زر اور اپنی سہولت کا راگ الاپا تو معاشی جدوجہد سماجی ابتری اور بدحالی میں تقسیم ہو گئی۔ مشرقی روایتی لباس متروک اور جدید فیشن اور مغربی ملبوسات رواج پا رہے تھے۔ اصلی شہر بمبئی اپنی معاشرت سمیت کہیں گم ہو چکا تھا اس کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ:۔

> "شہر میں آپ کو خاص شہر والا کوئی نہیں ملے گا۔ پنجابی ملے گا، بہاری ملے گا، یو۔ پی والا ملے گا، بنگالی ملے گا، مدراسی ملے گا، دکھنی ملے گا اور کبھی کبھی شہر بالکل انگلستان، امریکہ، جرمنی، جاپان نظر آئے گا۔ اول الذکر شہر کی آبادی میں اور موخر الذکر شہر کی تجارت میں۔۔۔ اصلی شہر کہیں نہیں ہے۔"(۴)

ابراہیم جلیس نے بڑے دکھ اور کرب کے ساتھ صدیوں کی زوال آمادہ تہذیب کے ڈھانچے پر نئی مہذب، تہذیب اور اس کی قدروں کا منافقانہ لبادہ نوچ پھینکا ہے۔ جس میں حصول زر اور ہوس زر نے فن اور آرٹ کی جمالیاتی قدروں کو ملیامیٹ کر دیا تھا۔ وقتی جذبے اور بناوٹی خوشیاں ہر طرف رقصاں تھیں۔ بظاہر فلمی صنعت، عروج پر تھی اور حصول روزگار با آسانی دستیاب تھا لیکن ادیب اور ادب ایک کڑے امتحان سے گزر رہے تھے۔ فلمی مکالموں کا مرچ مصالحہ کلچر عوام کی اخلاقی تربیت کے بجائے ادب اور آرٹ کی ناقدری اور ہوس زر کے پجاریوں کی رسد گاہ بن چکا تھا۔ ادیب اور دانشور ملک و قوم کا اثاثہ ہوتے ہیں اور قوموں کی تقدیر بدل دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن حصول معاش، سرمایہ دارانہ نظام، معاشرتی بگاڑ اور اخلاقی باختگی نے سارے نظام کو زنگ آلودہ کر دیا۔ ادیب اگر اپنے تخلیقی جوہر کو زہر آلودہ کر بیٹھے تھے تو ادیبوں کی سرپرستی کا کلچر بھی ناپید ہو گیا تھا جس کا ذکر غالبؔ، میرؔ، ذوقؔ اور ظفرؔ کے ہاں ملتا ہے۔ اخلاق باختہ معاشرے میں دیگر قدروں کے ساتھ ادبی اقدار بھی ملیا میٹ ہو گئیں۔ شہر کی رنگینی میں پنپتی معاشرتی برائیوں نے معاشرے کو جوہڑ میں بدلہ تو دانشور اذہان حواس قتل کر بیٹھے ایسے

معاشرے کے نقوش ابراہیم جلیس نے بڑی درد مندی سے کرب اور طنز کے ملاپ سے یوں بیان کیے ہیں کہ غالب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے:

> "جھوٹ شہر کی سب سے زیادہ تابندہ خصوصیت ہے۔ کوئی انسان اگر شہر میں خوشحال، صحت یاب اور بامراد زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے جھوٹ بولتے رہنا ہی ضروری ہے جتنا کہ شہری زندگی میں صحت مند رہنے کے لیے دن میں دس بارہ مرتبہ چائے پینا لازمی ہے۔ شہر میں جھوٹ کا بول بالا ہے آرٹ اور جلیوف کا منہ کالا ہے۔"(۵)

ابراہیم جلیس نے رپورتاژ میں عدم مساوات پر مبنی معاشرے کی خامیوں کا تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لیا ہے اور سماجی بے راہ روی کی روش پر چلنے والوں کے ساتھ اظہار ہمدردی بھی کیا ہے۔ کیونکہ معاشرے میں اصلاحی تربیت کے فقدان کے باعث معاشرتی برائیوں کا سدباب نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح عوامی رویوں میں وقتی مفادات کے حصول کا چسکا اتنا سرایت کر گیا۔ کہ وہ کسی قیمت پر پیچھے بیٹھنے کو تیار نہیں تھے۔ دوسری طرف سرمایہ دار مفادات کا مکروہ کھیل بڑی ایمانداری سے کھیل کر سارے معاشرے کو دستِ نگر بنانے کی تگ ودو میں مصروف تھے۔

مصنف نے استحصال یافتہ غریب طبقے کے مسائل اور سماجی اونچ نیچ کو جہاں اپنا موضوع بنایا ہے وہیں انگریز سامراج کے نظام سے تربیت یافتہ لیڈروں اور سرمایہ داروں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ صدیوں اکٹھے زندگی گزارنے والے ہندو مسلم ایک دوسرے کے ساتھ ان دیکھی محبت میں بندھے ہوئے تھے نفرت اور تفرقہ کے بیج بوئے جانے کے بعد جو فصل پک کر تیار ہوئی انگریز حاکم نے سود سمیت اس سے اپنا خراج وصول کیا۔ مقروض قرض کی ادائیگی کی خاطر سارا خاندان گروی رکھوا بیٹھتے۔ یا سر کا نذرانہ بطور سود ادا کر دیتے۔ جنسی حراسگی، عصمت دری اور خوں کی ہولی معمولی واقعات تھے جنہوں نے معاشرتی نظام کی دھجیاں بکھیر دیں۔ سماجی زوال پذیری اور مفاداتی کلچر میں بے حسی، مطلب پرستی اور دھوکہ دہی کو عروج حاصل ہوا۔ تو دھرتی انسان اور انسانیت دو مختلف دنیاؤں کا مسکن نظر آئی۔ مصنف اس بدحالی اور اخلاق باختگی پر نوحہ کناں ہے۔ جسے سردار علی جعفری نے یوں سراہا:

> "ابراہیم جلیس ایک دلنواز اور بے تاب روح کا نام تھا۔ اس کے سینے میں آزادی انسان کی تڑپ تھی جو لفظوں کی صورت میں اس کے قلم سے کاغذ پر کبھی اشکوں کی طرح ٹپکتی تھی اور کبھی تلخ تبسم کی طرح بکھرتی تھی۔ اس نے برطانوی سامراج کے زمانے میں انسان کی تذلیل دیکھی تھی جس نے اس کے دل میں انسانی وقار کی آرزو پیدا کر دی تھی۔۔۔۔ تلوار اور بندوق اس کے ہاتھ میں نہیں تھی وہ صرف قلم تک پہنچ سکتا تھا اور اُس نے قلم کو اٹھایا اور آخری سانس تک اس قلم سے جہاد کرتا رہا۔"(۶)

ادب میں معاشرتی مسائل کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ پریم چند، رام لعل، عصمت چغتائی، منٹو، اشفاق احمد، بیدی، اسد محمد خان، احمد ندیم قاسمی، طاہرہ اقبال، اور دیگر کئی ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں اپنے عہد اور اس کے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ ابراہیم جلیس نے اپنے رپورتاژ میں اسی روایت کو بھرپور طریقے سے نبھایا ہے۔ انہوں نے رپورتاژ میں معاشرے میں بکھرے ہوئے مسائل اور وسائل کو بڑی گہرائی سے مشاہدہ کر کے سپردِ قلم کیا ہے۔

شہر کی سماجی زندگی میں طوائف اور بالاخانے بھی موجود تھے۔ جہاں جسموں اور مجبوریوں کی قیمت ایک ساتھ لگتی

تھی۔ یہ سماجی برائی متمدن شہر کے متمول معاشرے میں سب سے زیادہ پائی جاتی تھی۔ عیش پرستی کی دکان پر جنسی و جسمانی عوارض بھی بکتے تھے مگر ہوس پرستی کی آنکھیں بند تھیں۔ یہاں ابراہیم جلیس کا تفکر منٹو کا ہمنوا نظر آتا ہے۔ جسے جسم بیچتی عورت کی مجبوری سے ہمدردی ہے۔ انہوں نے شہر کی سماجی روایت کا بڑے درد و کرب سے تمسخر اڑایا ہے کہ آزادی کے حصول کی خواہش کے نتیجے میں فسادات پھوٹے تو جن بیٹیوں کی عزتیں نیلام ہوئیں ان کا سر کسی نے نہ ڈھانکا وہ اپنوں کی بے حسی کا شکار ہو کر مجبوراً اس بازار کا حصہ بنیں۔ بے لگام معاشرے کی اس حیوانیت کو مصنف نے شعوری طور پر ابھارا اور اسے تضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔ تاکہ عوام الناس کو برائی کے اس آئینے میں ان کا عکس دکھایا جاسکے۔

معاشرے میں بڑھتے ہوئے جرائم سماجی کھوکھلے پن کی نشاندہی کے ساتھ طبقاتی کشمکش کے عروج کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ غریب اور محنت کش طبقے کثیر افراد خانہ کے ساتھ متقدر اور مالدار طبقے کے دستِ نگر نظر آتے ہیں۔ کم آمدنی اور نامناسب خوراک کے باعث لاعلاج بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں۔ نیم حکیموں کے ہتھے چڑھ کر تیر بہدف علاج کے ذریعے شہر خموشاں کے مکین جا بنتے ہیں۔ عوامی تنگدستی، مجبوری اور تفرقہ بازی کی دلخراش داستان سارے رپورتاژ میں بکھری ہوئی ہے۔ مصنف نے سرمایہ دار اور مفاد پرست حاکم کے گٹھ جوڑ کو معاشرے کو مزید ابتری کی طرف دھکیلنے کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ یہاں ترقی پسند تحریک نے ادیبوں کو پسے ہوئے طبقے کی آواز بننے کی جو آدرش دیا تھا۔ وہ اسے بخوبی نبھاتے نظر آتے ہیں۔

سماجی زوال پذیری اور طبقاتی کلچر کی پرورش میں مفاداتی رویوں کو عروج حاصل ہوا تو مصنف نے ایسی اخلاقی اقدار کی ناقدری پر قلم کے کاری وار کیے۔ اشرافیہ کو آڑے ہاتھوں لیا کہ انہوں نے یہ تنگدستیاں بانٹی ہیں اور معاشرے کو مصنوعی پن کی طرف دھکیلا ہے۔ انہوں نے ایک تلخ حقیقت کا پردہ چاک کیا ہے۔ شہر کے مضافاتی علاقوں کے رہائشیوں نے فلمی چکاچوند سے متاثر ہو کر یہاں کا رُخ کیا۔ تو ان کے لباس، رسوم و رواج اور حلیوں میں اس کی نقالی نظر آنے لگی مگر جب تنگدستی نے گھیرا تو چھوٹی موٹی نوکریاں کرنے کے یا جرائم کی طرف راغب ہو گئے۔ اس کے پیچھے بھی انہوں نے بے حس مفاداتی طبقے کی مطلب براری اور دھوکہ دہی کو سماجی اقدار کی زوال پذیری کا شاخسانہ قرار دیا۔ وہیں عوام کے بدلتے سماجی رویوں اور معاشرے میں پنپتی زر پرستی کی حکمرانی اور اشتہار کلچر کو یوں طنز کا نشانہ بنایا ہے:

> "میں جواہر لعل نہرو کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ نئی حکومت کے قوانین سے عمر قید اور قصاص کی سزا ممنوع کر کے سنگین مجرموں کو شہر کے سارے سائین بورڈ پڑھنے اور کاغذ پر لکھنے کے لیے چھوڑ دیا جائے عمر قید اور قصاص اس سزا کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔"(۸)

ابراہیم جلیس نے شہر کی باطنی اور خارجی زندگی کی عکاسی طنزیہ اسلوب میں نمایاں کرتے ہوئے جگمگاتی روشنیوں کے پیچھے سسکتی بلکتی انسانیت کے بیاطن جھانکنے کی کوشش کی ہے اور چارلس ڈکنز کے قول ہر شہر کے اندر دو شہر ہوتے ہیں، کو عملی طور پر ثابت کیا ہے۔ شہر کی نمود و نمائش اور اس کے باطن عریانی، غربت اور بھوک کے ساتھ سماجی بدصورتیوں کو ہمارے نفسیاتی و عمرانی مسائل کے اندر دکھانے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ شہری زندہ مقناطیسیت سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا لیکن غریب شہر کی زندگیوں سے مس ہونے کے بعد ہی اس کی تابندگی برقرار رہتی ہے۔

تہوار، میلے ٹھیلے اور رسوم و رواج معاشرتی، ثقافتی علامتیں ہیں۔ جو قوموں کے گروہی یا طبقاتی تقسیم کے بعد تقسیم در

تقسیم کے عمل سے دوچار ہو کر تہذیبی زوال کی نشاندہی کرتی ہیں۔ شہری زندگی کے مخلوط کلچر میں طرز رہائش کے ساتھ مختلف ثقافتوں کے لباس اور پہناوے بھی ملتے ہیں۔ مقامی لباس کے ہمراہ مغربی فیشن نے شہر کے اپنے کلچر اور ثقافت پر غلبہ حاصل کیا۔ تو مخلوط طرز معاشرت نے سارے بمبئی شہر کو ڈھانپ لیا۔ اس کی مخصوص تہذیب و ثقافت قصہ پارینہ بن گئی۔ بقول جلیس:۔

> "شہر کا اپنا کوئی خاص لباس نہیں ہے جس طرح ہم پنجاب کی شلوار، لکھنؤ کی دوپلی، کلکتہ کی دھوتی، حیدر آباد کی شیروانی، اپنے اپنے مقام کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس شہر کا کوئی نمائندہ لباس نہیں ہے۔ یہاں آپ کو ہر ملک اور ہر قوم کا لباس نظر آئے گا۔"(۹)

ادب اپنے عہد کی ترجمانی کرتا ہے۔ رپورتاژ شہر کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بیسویں صدی کے درمیانی عشرے میں ادب میں کون کون سے موضوعات پر لکھا جا رہا تھا۔ متحدہ ہندوستان یا قیام پاکستان کے بعد کن اصناف ادب کو دوام حاصل ہوا۔ غیر ممالک میں ادب کے رویے اور برتاؤ کیا تھے اس عہد کے اہم لکھاری کون تھے جو معاشرتی و سماجی مسائل اور ادبی رویوں یا تبدیلیوں کو پیش کر رہے تھے۔ مصنف نے شہر کے تعیش پسندانہ مزاج میں ادب اور آرٹ کی ناقدری کا نوحہ سنایا ہے تو دوسری طرف زر کی حکمرانی کے آگے ادیبوں کو معاشی بدحالی اور اذیت ناکی کا اظہار بھی کیا ہے۔ انہوں نے ہم عصر ادیبوں، علی سردار جعفری، قدوس صہبائی، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، جوش ملیح آبادی، حمید اختر، ہاجرہ مسرور، کمال امروہی، ساغر نظامی، اختر الایمان، جان نثار اختر، رفعت سروش، قمر جلال آبادی اور شاہد لطیف جیسے ادیبوں کی بمبئی کی زندگی میں قسمت آزمائی کا تذکرہ بھی فنکارانہ چابکدستی سے کیا ہے۔ ترقی پسند ادیبوں اور شعراء نے ادبی دنیا میں نام کمایا لیکن ایک مخصوص سوچ اور نظام کے ساتھ فکر معاش اور ذہنی ناہمواری کا مقابلہ کرتے ہوئے حق سچ کی آبیاری کا تمغہ سینے پر سجایا۔

رپورتاژ شہر میں اس عہد کے اہم شائع ہونے والے ہفتہ وار، روزناموں اور ماہناموں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ جن میں چھپنے والی تحریروں سے ایک ادبی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ یہ اپنے عہد کے تاریخی واقعات کی معتبریت کو بھی ثابت کرتے ہیں۔ اس عہد میں غزل کو مقبولیت حاصل تھی تو ہر نئے لکھنے والوں کو جو بدایونی، لکھنوی، دہلوی یا حیدر آبادی کا تخلص شد و مد کے ساتھ استعمال کر رہے تھے کہ اصلاح کی خاطر ان کی شاعری رسائل کے مخصوص صفحات پر چھپا کرتی تھی۔ وہیں ان جرائد کی تاریخ میں خصوصی نمبرز چھاپنے کی جو دوڑ لگی ہوئی تھی اس میں ٹائٹل پیج پر چھپنے والی مشہور فلمی ستاروں کی تصاویر صرف حصول زر کا ذریعہ تھیں۔ ان اہم معلومات کی فراہمی کے ساتھ جرائد کے انداز پیشکش کو مصنف نے تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

ابراہیم جلیس نے اپنے عہد میں چھپنے والے عمومی رسائل کا تذکرہ بھی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے کہ ان کے سبب عوام سستی خرافات اور جذبات برانگیختگی میں مبتلا ہوئے وہیں انہوں نے معیاری ادبی رسائل جس میں سرِ فہرست نیا ادب، نیا زمانہ، ادب لطیف، نظام ادبی دنیا، افکار، ارباب، اور خمستان شامل تھے کا ذکر انہیں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ کیونکہ ان کے اعلیٰ معیار کی بدولت قارئین کی ادبی تربیت ممکن ہوئی۔ کسی ادبی جریدے یا رسالے کا معیار کا ضامن اس کے مدید کا ادبی لگاؤ ہوتا ہے۔ اعلیٰ معیاری ادبی رسائل اس خوبی کو کماحقہ ادا کرتے تھے۔ جبکہ عمومی رسائل میں "ایڈیٹر کی ڈاک" کا سلسلہ سستی جذباتیت رومانویت اور جنسی شہوت پسندانہ جذبات کی تسکین کے سوا کچھ قدر و قیمت نہ رکھتے تھے۔ مصنف نے ہوس زر، تعلیم و تربیت،

تہذیب و اخلاق اور ادبی لگاؤ کے ساتھ معاشی و معاشرتی صورتحال، سماجی ابتری اور مذہبی منافرت جیسے موضوعات اپنانے والے ادیبوں کی مخلصانہ کوشش کو سراہا ہے اور ترقی پسند ادیبوں کی مشکلات کا تذکرہ کر کے اس جانب توجہ مبذول کروائی ہے کہ ادب پیش کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ انہوں نے ایک اور رپورتاژ میں بھی تحریک سے وابستہ ادیبوں کا مشکلات کے باوجود ثابت قدمی سے ڈٹ کر حالات کا مقابلہ جرات مندی سے کرنے پر انہیں یوں حوصلہ دیا ہے:۔

"ہم ایک بورژوا دیس کے ادیب ہیں۔ کل ہمارا بھی زمانہ آئے گا اور یہاں کے بڑے بڑے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے ہم انتقام لیں گے۔ آج جس جاڑے میں ہم ٹھٹھر رہے ہیں کل اسی جاڑے میں سرمایہ دار جاگیرداری اور شہنشائیت ٹھٹھر کر مرے گی۔"(۱۰)

ابراہیم جلیس نے بمبئی شہر میں بمقام اندھیری کرشن چندر کے گھر کو ادبی بیٹھکوں کے کامیاب انعقاد پر "اصلی شہر" کے نام سے یاد کیا ہے۔ ادبی بصیرت کی یہ روح پرور محفلیں ادب کے جدید رجحانات اور تازہ نگارشات کے ساتھ روبہ زوال ادبی قدروں کے انمٹ ثبوت ہیں جنہیں مصنف نے رپورتاژ میں مفصل بیان کیا ہے۔ انہوں نے کئی تاریخی واقعاتی سچائیاں اسی رپورتاژ میں قلمبند کی ہیں۔ مثلاً کرشن چندر نے آل انڈیا اردو کانفرنس منعقد بمبئی کی صدارت کی جس میں انہوں نے مہمانوں کی کسمپرسی کے باوجود سگریٹوں اور چائے کے ساتھ تواضع کی تھی۔ سجاد ظہیر کی نظریاتی وابستگی نے ترقی پسند ادیبوں کو سماجی حقیقت نگار کے طور پر ابھرنے میں مدد دی وہیں انھوں نے فلمی چکاچوند سے متاثر ہو کر ادبی رویوں سے انحراف کرنے والے ادیبوں کی ان الفاظ میں سرزنش کی تھی:۔

"لکھنے کا موڈ (Mood) ہی نہیں آتا۔۔۔۔ بنتے ہیں آپ لوگ۔۔۔ اب موڈ کی آڑ لیتے ہو۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اب تم سب لوگ بمبئی کی زبان میں خلاص ہو چکے ہو۔"(۱۱)

مصنف نے ساحر لدھیانوی کی زبانی فلمی چکاچوند میں جذباتی ہیجان انگیز شاعری کرنے والوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور فلمی سیٹھوں کی ہوس زر کی آڑ میں ادب کی مرمت، لاچاری اور بے قدری کی دردمندانہ تلخ سچائی کو نمایاں کیا ہے۔ انہوں نے واضح کیا ہے کہ ادب کے ذریعے معاشرتی مسائل کا حل دیا جاسکتا ہے۔ مگر فلم کو پروموٹ کرنے والے نہ تو ادب فہم ہیں اور نہ ہی محبِ ادب۔ ان کے رویوں نے ادب کی غلط تاویلات پیش کر کے ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ ادب کے متعلق اتنا واضح نکتہ نظر مصنف کے ادبی شعور اور ان کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کی اس خوبی کے متعلق ساحر لدھیانوی نے انہیں یوں سراہا تھا:۔

"جلیسوف تم ہندوستان کے چیخوف ہو چیخوف تمہاری کہانیاں بورژوائی دور کی سنگین ترین کہانیاں ہیں۔ بعض اوقات تو مجھے تمہارے مقابلے میں کرشن چندر بھی ہیچ نظر آتا ہے۔"(۱۲)

ابراہیم جلیس نے اپنے عہد کی معاشی، معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کو بڑی گہرائی سے مشاہدہ کرنے اور برتنے کے بعد تلخیوں، تاریکیوں اور سچائیوں کے ہمراہ اپنے رپورتاژ مس پیش کیا۔ ان کے پیش کردہ حالات کے آئینے میں مستقبل کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ یہ حالات و واقعات کو مخالف سمت موڑ کر معاشی خوشحالی، سیاسی امن و امان، تہذیبی استحکام اور مذہبی آزادی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ابراہیم جلیس نے تلاش روزگار اور حق کے اظہار میں بے حد مشکلات کا سامنا کیا۔ انہوں نے اپنی تہذیبی

روایات اور معاشرت کو سنوارنے کی کوشش کی۔ انہوں نے فنون لطیفہ پر قابض دلال سیٹھوں اور زر پرستوں کے مفادات کا بھانڈا پھوڑا تو فاقوں اور بے روزگاری کے عذابوں کا سامنا کیا۔ فن اور روزگار کے دوراہے کو انہوں نے فن کی انگلی تھام کر فخر سے عبور کیا۔ اخلاقی گراوٹ کا شکار سیاسی حکام بالا کو معاشرتی زوال کا سبب قرار دے کر بورژوا طبقے کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ انہیں زر کے آگے فن کی قربانی دینا گوارا نہیں تھا۔ ان کا واضح نقطہ نظر یہی تھا:۔

"آرٹ جا تقاضا تو یہ ہے کہ مکالموں میں کردار نگاری کی جائے۔ یہ مکالمے اس جگہ ایسے ہی سیدھے سادھے ہونے چاہیں۔ پبلک چاہے تالی بجائے چاہے نہ بجائے پبلک کی تالی کے لیے آرٹ کو قربان نہیں کیا جاسکتا۔"(۱۳)

تقسیم ہند کے بعد فسادات کے ہنگاموں میں سسکتی بلکتی انسانیت کے جنازے کو بہت سے ادیبوں نے پُرسا دیا۔ لیکن ان صفوں میں چند ایسے مفاد پرست بھی شامل تھے جنہوں نے ادب میں تو کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا مگر اپنی سازشی ذہنیت اور عیاری سے مقبول ادیبوں کے خلاف خوب ہرزہ سرائی کی۔ جس کے باعث ان ادیبوں کے لیے مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔ مخصوص ذہنیت کے عیار اور مفاد پرست جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو عوام کے حق کے لیے آواز بلند کرنے کی ترغیب دلانے والے ادیبوں کے خلاف یکجا کر دیا۔ ترقی پسند ادیب خاص طور پر اس زد میں آئے انہیں میں ابراہیم جلیس بھی شامل تھے۔ وہ نامساعد جارحیت اور اپنوں کی منت سماجت کے بعد پاکستان ہجرت کر آئے اور یہاں دل و جان سے اپنی محبت کا مرکز پاکستان کو بنایا مگر افسوس یہاں زر پرست سرمایہ دار، اور مارشل لاء حکمرانوں نے انہیں ایجنٹ کہہ کر معیشت کے دروازے ان پر بند کر دیے۔ وہ غلامانہ ذہنیت اور زر کی بالادستی کے خلاف ڈٹ گئے۔ انہوں نے نذرانہ کلچر اور سیاسی شعبدہ بازی کے ڈانڈے جنوبی ہند کے کال سے ملائے انہوں نے اپنا تخلیقی ضمیر اور قلم سرنگوں نہ ہونے دیا۔ حیدر آباد ریڈیو سکرپٹ رائٹنگ، فلمی مکالمہ نگاری اور اخبارات کی کالم نگاری سے وابستگی اور برخاستگی کو انہوں نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا انہوں نے مفاد پرست اور زر پرست پبلشرز کے فروغی لٹریچر چھاپنے کی ترغیب کو نہ صرف ٹھکرایا بلکہ واضح نقطہ نظر بیان کیا کہ ادب صرف بلند مقاصد کے حصول کے لیے عوام کو مسائل سے آگاہی اور حکومت وقت کو آسائشات کے پیچھے غلط فیصلوں سے تنبیہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، اور ابن انشاء کے ہمراہ کئی ادیب ان کے ہمنوا تھے جنہوں نے قلم کی آبرو کو سراہا۔ اس خاصیت کے متعلق محمد علی صدیقی نے لکھا تھا:۔

"اہم ادیب وہی ہو سکتا ہے جو اپنی انگلی نبض دوراں پر رکھ دے اور اپنے عوام کو وہ خلوص اور محبت دے سکے جس کے وہ طلب گار ہوتے ہیں۔ ابراہیم جلیس نے ترقی پسند تحریک کے آغاز ۱۹۳۶ء سے ہی اپنا رشتہ اپنی ریاست، اپنے ملک اور اپنی دنیا کے عوام سے جوڑ لیا تھا۔"(۱۴)

ابراہیم جلیس نے تہذیبی و تمدنی ترقی اور خوشحالی کے پیچھے شہر میں موجود طبقاتی کشمکش کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ دنیا میں امیر اور غریب یا حاکم اور محکوم کی جنگ صدیوں سے جاری ہے انسان سماجی مرتبہ حیثیت یا حصول دولت کی خاطر خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ کم اجرت اور زیادہ منافع کا لالچ امیر اور حاکم طبقے کو غریب کے استحصال پر متحرک رکھتا ہے۔ جبر کے تحت عوام کو مغرور حاکم اپنے تابع رکھنے کے لیے ان کی رائے کو اہمیت نہ دے کہ ان کے حقوق غضب کرتے ہیں۔ ہر عہد اور اس کی تاریخ کے بیانیے میں یہ تلخ حقائق دیکھے جاسکتے ہیں۔

سماجی و معاشرتی زندگی میں ترقی ارتقائی منازل سے آگے کی طرف رواں ہوتی ہے تو جائزہ و ناجائز خواہشات کا حصول اس طبقاتی کشمکش کو بڑھاتا ہے۔ مذہبی اجارہ داری کا کارڈ کھیل کر اور کبھی اسلام کے نام پر سادہ لوح عوام کو بھڑکایا اور لوٹا جاتا ہے۔ خوشحالی کے جھوٹے دعووں کی قلعی اس وقت کھلتی ہے جب اقتدار کا سورج مفادات کی روشی کے ساتھ جگمگاتا ہے۔ سرمایہ دار تہذیب ایک نئے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے جہاں چھوٹے پیشوں سے وابستہ افراد بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ سرمایہ دار اور مقتدر طبقے کا یہ کاروباری ہتھکنڈا مذہب کی ٹوپی پہن کر اور مسالک کی ٹوکری سر پر سجا کر ہر جائز و ناجائز طریقے سے روا رکھا جاتا ہے جس کے لیے عوام کو شعوری بیداری سے دور رکھا جاتا ہے۔ مادیت پرستی اور اشتہار انگیزی کے اس رویے اور عمل کے آگے واحد سیسہ پلائی دیوار کا نام "ادب" ہے کیونکہ جب انسانیت نصب العین ٹھہرے تو اس کی آبیاری صرف اسی ذریعے سے ہو سکتی ہے۔ ابراہیم جلیس نے اسی پلیٹ فارم کے ذریعے تماشہ گر اور تماش بین دونوں کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ نیز انہوں نے ہندو مسلم فسادات کا شاخسانہ بھی اسی طبقاتی کشمکش کو قرار دے کر اس کے سجائے ہوئے کھیل تماشے کو سولی چڑھانے کی حمایت کی ہے۔

ابراہیم جلیس کارل مارکس کے نظریات سے بے حد متاثر تھے وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے تو انسانیت کو اپنا آدرش مان کر معاشرتی ناہمواری اور سماجی ابتری کے خلاف قلم سے نبرد آزما ہوئے اس جرم کی پاداش میں ان کی آزادی جیل کی سلاخوں میں قید کر دی گئی۔ جہاں جبراً سیاسی اور سیفٹی ایکٹ کا قیدی ہونے کے باوجود انہوں نے جیل اور اس کی ناہمواریوں کے خلاف دردمندانہ تجزیہ پیش کیا۔ انہوں نے جیلر کی زبان سے یہ جملہ "کیا تم ترقی پسند ادیب ہو" کہلوا کر اس ادبی تحریک سے وابستگی اس کے نظریات کی پاسداری اور اس کے اثرات کے خوف سے برہم ہو کر انہیں ذہنی و جسمانی ایذا پہنچانے والے غلط اقدام کو سختی سے رد کیا۔

قلم کی طاقت کے آگے وقت کے فرعونوں نے سر جھکایا ہے۔ اس کی طاقت حکمران ایوانوں کی بنیادی ہلا سکتی ہے۔ ادیب کی قلم کی طاقت کو سراہتے ہوئے وہ میکسم گورکی، رولاں بارتھ، رومین جیولس، فیوچک، رالف ناکس اور کارڈویل جیسے عالمی ادیبوں کے ہمنوا نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے قلم کے ذریعے انسانیت کا پرچم بلند کیا۔ انہیں بھی ایسے قبیلے کا باشندہ بننا پسند تھا۔ انہوں نے ناصحانہ انداز میں ادیب کے سماجی تفکر اور انسان دوستی کا پرچار کیا ہے۔ یاسیت کی راکھ سے انہوں نے عزم و حوصلہ کی چنگاری جگائی۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنی دوسری تحریر میں یوں کیا ہے:۔

> "جو دل انسانیت سے محبت کرتا ہے وہ ظلم سے کبھی نہیں ڈرتا جو قدم سچی منزل کی طرف اٹھتا ہے وہ نہ تو کبھی ڈگمگاتا ہے اور نہ پیچھے لوٹتا ہے۔"(۱۴)

انہوں نے جمہوری ملک میں تعمیری اور تنقیدی سوچ کو سراہا اور اس کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے نو آبادیاتی بننے کے بعد غلامانہ ذہنیت سے چھٹکارا پانے کی خواہش کا اظہار رپورتاژ میں بین السطور بیان کیا ہے۔ رپورتاژ کا حسن کسی واقعہ کی دلچسپ ادبی روداد کے بیان میں پنہاں ہے۔ ابراہیم جلیس نے حقیقی واقعات و حالات کو اتنی دلچسپی سے سنایا ہے کہ ان کے سنگ قاری محظوظ ہونے کے ساتھ تاریخ کے اندر جھانکنے کی طلب محسوس کرتا ہے۔ ان کے بیان کردہ حقائق میں افسانے کی کہانی، ناول کا پلاٹ، انشائیے کی خوبی، ڈرامے کی منظر کشی اور کردار نگاری کے ساتھ خود مصنف کی ذات کی شمولیت آپ بیتی اور سوانح کا مزہ ملتا ہے۔

ان کے بیان کردہ حقائق دیگر ادیبوں کے ہاں بھی استعمال ہوئے ہیں جو ان کے بیانیے کی توثیق کرتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ رپورتاژ ادبی تاریخی، سماجی اور تہذیبی صورتحال کی عکاسی کے علاوہ ایک دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ انہوں نے اپنی ایک کتاب کے پیش لفظ میں لکھا تھا:۔

> "مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ میری کتاب "ادب عالیہ" کی الماری میں جگہ نہ ملے۔ مجھے کسی ادبی انعام کی بھی پرواہ نہیں۔ البتہ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اگر میری تحریر قاری کے ذہن میں سوچنے کے لیے ایک بھی اچھا خیال چھوڑ جائے اور کسی کے دکھ سے مرجھائے ہوئے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آمیز، ایک مسکراہٹ ہی بکھیر دے تو پھر میری زندگی کا سب سے بڑا انعام مجھے مل جائے گا۔"(۱۶)

ابراہیم جلیس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ انسان دوست ادیب تھے۔ انہوں نے معاشرتی برائیوں، سماجی تنزل، سامراجی نظام کے بعد ذہنی غلامی، مذہبی منافرت اور تہذیبی انحطاط کو بہت قریب سے دیکھا اور ان تمام واقعات کا ذاتی شکار ہونے کے بعد انہیں اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا۔ ایک طرف ان واقعات کے بیانیے میں ہمہ گیر سچائی اور آفاقیت ملتی ہے تو دوسری طرف آپ بیتی اور خوں چکاں داستان کا منظر بھی پیش کرتی ہے۔ ان کی ادبی تربیت جس ماحول میں ہوئی اور جو سماجی آگاہی انہیں حاصل ہوئی اسے شعوری طور پر انسانیت کے حق میں آواز بلند کرنے کے لیے انہوں نے استعمال کیا۔ وہ ایسے انسان دوست پر چاری کے طور پر سامنے آئے جس نے متنوع موضوعات کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی اور کہیں تضادات کا شکار نظر نہ آئے اگرچہ مذہبی شدت پسندی کی لہر میں ڈوب کر وہ ایک بار "ترنگے کی چھاؤں میں" جیسی تحریر لکھ بیٹھے مگر اپنے اسی تجربے سے انہوں نے جو سبق سیکھا پھر عمر بھر اُس کو نہ بھلایا۔

ادبی رچاؤ، پختہ سماجی شعور اور طنز و مزاح سے بھرپور اسلوب نگارش نے انہیں قلم کے ہتھیار کے زریعے ادبی شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ معاشی و سیاسی استحصال پسندی، اور جھوٹی نمود و نمائش کے پردے میں تذلیل انسانی کے گھناؤنے فعل کو انہوں نے بیانگ ویل للکارا۔ تمدنی زندگی کے ہمرکاب تہذیبی زوال پذیری اور اخلاقی اقدار کی تنزلی کو انہوں نے موضوع بنا کر انسانیت کا ایک طرف نوحہ بیان کیا ہے تو دوسری طرف آئینہ دکھا کر انہیں کھنڈرات سے مستقبل سنوارنے کی امید بھی دلائی ہے۔ بحیثیت مجموعی ان کا رپورتاژ "شہر" ایسی نایاب اور کمیاب مگر پُر اثر تحریر ہے جو ابراہیم جلیس کے ادبی قد کاٹھ کا مقام متعین کرتی ہے۔ اگر آج محمد حسین آزاد زندہ ہوتے تو انہیں ضرور شہرت عام کے دربار میں بقائے دوام کی مسند پر بٹھاتے۔

حوالہ جات

1. محمد حسن، ڈاکٹر، ہندوستانی ادب کا تصور، مشمولہ آڑے ترچھے آئینے، (دہلی: تخلیق پبلشرز، ۲۰۱۱ء)، ص ۱۵۰
2. طارق، اردو ادب میں سماجی اقدار کا تصور، (مضمون)، مشمولہ، اردو دنیا، (ماہنامہ)، (کراچی: قومی کونسل، برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۹ء)
3. ابراہیم جلیس، شہر، مشمولہ سپوتنک، (لاہور: پرنٹرز رائٹر بکس، ۲۰۰۱ء)، ص ۶۱
4. ایضاً، ص ۵۰
5. ایضاً، ص ۲۹
6. علی سردار جعفری، ابراہیم جلیس، مشمولہ، ماہنامہ شگوفہ (حیدر آباد دکن: معظم چابی مارکیٹ، ۱۹۷۸ء)، ص ۱۰
7. ایضاً، ص ۴۶
8. ایضاً، ص ۴۱
9. ابراہیم جلیس، دو ملک ایک کہانی، (لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۵۵ء)، ص ۱۷۴
10. ابراہیم جلیس، شہر، مشمولہ سپوتنک (لاہور: پرنٹرز رائٹر بکس، ۲۰۰۱ء)، ص ۶۴
11. ایضاً، ص ۶۹
12. ایضاً، ص ۳۰
13. محمد علی صدیقی، ابراہیم جلیس، مشمولہ، طلوعِ افکار ماہنامہ، (کراچی: رضویہ سوسائٹی، جنوری، ۱۹۹۰ء)، ص ۳۲
14. ابراہیم جلیس، بنگال میں اجنبی، (ڈھاکہ: پاک کتاب گھر، س ن)، ص ۷۹
15. ابراہیم جلیس کتاب کی کہانی، پیش لفظ مشمولہ ہنسے اور پھنسے، (دہلی: الجمعیت پریس، ۱۹۷۸ء)، ص ۹